خانقاہِ چشتیہ صابریہ کا اصلاحی و دعوتی ترجمان

سہ ماہی

صدائے قطبِ دکن

حیدرآباد

اکتوبر، نومبر، ڈسمبر ۲۰۲۲ء

سرپرست

فریدِ وقت جانشینِ قطبِ دکن

حضرت مولانا شاہ محمد نور الحق قریشی قاسمی دامت برکاتہم

مدیر

محمد فضیل قریشی

قطبِ دکن اکیڈمی حیدرآباد

خانقاہِ چشتیہ صابریہ کا اصلاحی و دعوتی ترجمان

سہ ماہی

صدائے قطبِ دکن

حیدرآباد

اکتوبر، نومبر، ڈسمبر

سرپرست

فریدِ وقت جانشین قطبِ دکن

حضرت مولانا شاہ محمد نور الحق قریشی قاسمی دامت برکاتہم

مدیر

محمد فضیل قریشی

قطبِ دکن اکیڈمی حیدرآباد

فہرست مضامین

مضامین	اسمائے محررین	صفحہ نمبر
درسِ قرآن	مولانا محمد زبیر قریشی مفتاحی	۳
درسِ حدیث	مولانا محمد ضیاء الحق قریشی مفتاحی	۴
سیرت (قسط نمبر: ۲)	حافظ محمد سفیان قریشی	۵
حیات قطبِ دکن (قسط نمبر: ۲)	مولانا سعید الحق صاحب قریشی	۱۰
مسئلہ مفقود یتِ معنیٰ	حضرت مولانا شاہ محمد عبد الغفور قریشی نور اللہ مرقدہٗ	۱۴
شرک کی قباحت اور اس کی قسمیں	محمد فضیل قریشی	۲۰
ماہِ ربیع الاوّل	شیخ عتیق قاسمی پورنوی	۲۴
مدارسِ اسلامیہ کی قبا کیوں ضروری ہے؟	مولانا فاروق صاحب مفتاحی	۲۸
سلاسلِ اربعہ کی خصوصیات وتعلیمات	مولانا یوسف صاحب مفتاحی	۳۱

❑❖❑

سلسلہ وار (ماخوذ از: ہدایت القرآن)

درسِ قرآن

از قلم:
مولانا محمد زبیر قریشی مفتاحی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ○

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

﴿وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِۣ ۙ الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَهٗ ۙ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ ۚ كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۖ وَ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ ؕ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۙ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ؕ اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ ۙ﴾ (سورۂ ہمزہ، پارہ: ۳۰)

ترجمہ: ہر طعنہ زن عیب چیں کے لیے بڑی خرابی ہے جس نے مال جمع کیا اور اس کو گن گن کر رکھا، کیا وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اس کو زندہ جاوید کرے گا، ہرگز نہیں! وہ ضرور حطمہ میں ڈالا جائے گا اور آپ کو کچھ معلوم ہے حطمہ کیا ہے؟ اللہ کی دہکائی ہوئی آگ ہے جو دلوں کو جھانکے گی، وہ ان پر لمبے لمبے ستونوں میں موندی ہوگی۔

تفسیر: اس سورت میں گھاٹے میں رہنے والوں کی پہلی مثال ہے اور وہ دولت کے پجاری ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ دولت ان کو زندہ جاوید کرے گی، ایسے لوگوں میں یہ عیب پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ لوگوں کے عیوب ڈھونڈتے ہیں اور ان کی بُرائی کرتے ہیں، یہ خطرناک بیماری ہے، اس سے بچنا چاہیے۔

مال فی نفسہ بُرا نہیں ہے، یہ تو مایۂ زندگانی ہے اور اس کی محبت بھی بُری نہیں ہے، وہ بھی فطری ہے؛ مگر یہ بات اُس وقت ہے جب مال جائز ذرائع سے حاصل کیا جائے اور جائز جگہوں میں خرچ کیا جائے؛ ورنہ مال وبال ہے، ساتھ آنے والا نہیں، نہ وہ دنیا میں اَمر کرتا ہے، وہ یہیں رہ جاتا ہے اور بعد میں لوگ اس کو اُڑاتے ہیں، پس جو شخص مال کو خدا بناتا ہے اور جمع کرتا رہتا ہے، اس میں طعنہ زنی اور عیب جوئی کا مرض پیدا ہو جاتا ہے، یہ مصیبت در مصیبت ہے، ایسے شخص کو حطمہ میں ڈالا جائے گا اور حطمہ اللہ کی دہکائی ہوئی آگ ہے یعنی دوزخ کی آگ جو صرف ظاہر بدن کو نہیں جلائے گی، لمبے لمبے ستونوں میں موندی ہوئی ہوگی، جس سے اس کی ہیبت اور بڑھ جائے گی اور لمبے لمبے ستونوں میں کس طرح ہوگی؟ وہ جہنم میں جا کر ہی سمجھ میں آ سکتا ہے (اللہ ہماری جہنم سے حفاظت فرمائے)۔

❑❖❑

درسِ حدیث

قسط (۲)

لباس کیسا ہونا چاہیے

ازقلم:
مولانا محمد ضیاء الحق صاحب قریشی

عَنْ أَبِی الْأَحْوَصِ عَنْ عَنْ أَبِیْهِ قَالَ أَتَیْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَعَلَیَّ ثَوْبٌ دُوْنٌ فَقَالَ لِیْ أَلَكَ مَالٌ؟ قُلْتُ نَعَمْ! قَالَ: مِنْ أَیِّ الْمَالِ؟ قُلْتُ كُلِّ الْمَالِ قَدْ أَعْطَانِیَ اللهُ مِنَ الْإِبِلِ وَالْبَقَرِ وَالْغَنَمِ وَالْخَیْلِ وَالرَّقِیْقِ، قَالَ: فَإِذَا آتَاكَ اللهُ مَالًا فَلْیُرَ أَثَرُ نِعْمَةِ اللهِ عَلَیْكَ وَكَرَامَتِهِ. (رواه أحمد)

ترجمہ: حضرت ابوالاحوص رضی اللہ عنہ نے اپنے والد سے نقل کیا ہے کہ مَیں جناب نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں آیا اور میرے بدن پر ناکارہ کپڑے تھے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تمہارے پاس مال ہے؟ مَیں نے عرض کیا جی ہاں! فرمایا: کس قسم کا مال ہے؟ مَیں نے کہا ہر قسم کا مال اللہ نے مجھے عنایت فرمایا ہے، اُونٹ، گائے، بکری، غلام، آپ ﷺ نے فرمایا: جب تمہیں مال دیا گیا ہے تو تم پر اللہ کی نعمت کا اثر نظر آنا چاہیے اور اس کا اثر بھی معلوم ہو کہ اس نے یہ نعمت عطاء کی ہے۔

(یہ نسائی کی روایت ہے شرح السنہ میں دیگر الفاظ سے منقول ہے۔)

حدیثِ پاک کا مطلب یہ ہے کہ اچھا کپڑا پہننا چاہیے؛ تاکہ لوگ سمجھیں یہ تو مالدار ہے اور اللہ نے بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے، شرح السنہ میں لکھا ہے کہ یہ چیز نئے اور صاف ستھرے کپڑے پہننے سے حاصل ہوتی ہے، جس قدر وسعت ہو اس کے مطابق؛ لیکن ان تمام چیزوں میں مبالغہ آرائی سے بچنا چاہیے، اسی طرح باریک کپڑے پہننے سے بھی بچنا چاہیے، آپ ﷺ سے منقول ہے کہ آپ دو شہرتوں سے منع فرماتے تھے: ایک باریک کپڑے سے، دوسرے موٹے کپڑے سے، اسی طرح نرم اور سخت سے، دراز اور کوتاہ سے؛ بلکہ اس کے درمیان ہونا چاہیے۔

کپڑوں کی نظافت اور نفاست افعالِ ایمانیہ میں سے ہے، بشرطیکہ یہ تواضع انکساری اور زہد عن الدنیا کے ساتھ ہو۔

اگر کپڑوں میں پُرانے لباس کا استعمال ہو تو یہ بھی تواضع اور اخلاص کی وجہ سے ہو، بخل، کنجوسی اور مزاج کے گندہ اور طبیعت کی خساست کی وجہ سے ہو تو یہ قبیح اور قابلِ مذمت ہے۔

❑❖❑

قسط (۲)

سیرتِ نبوی ﷺ اور اس کی گوناگوں خصوصیات

از قلم:
حافظ محمد سفیان قریشی

سیّد محمد بن عبداللہ بن عبدالمطّلب بن ہاشم بن عبدمناف بن قصی ہمارے نبی ﷺ ہیں، دادا نے آنحضرت ﷺ کا نام محمد ﷺ اور ماں نے خواب میں ایک فرشتے سے بشارت پا کر احمد رکھا تھا۔

نبی ﷺ حضرت ابراہیم (خلیل الرحمٰن وابوالانبیاء علیہ السلام) کی اولاد سے ہیں، جو ہاجرہ بی بی کے بطن سے ہوئی، ہاجرہ بادشاہِ مصر ''رقیون'' کی بیٹی تھیں، اللہ کے یہاں ان کا درجہ ایسا تھا کہ اللہ کے فرشتے ان کے سامنے آیا کرتے اور اللہ کا پیغام پہنچایا کرتے تھے۔

ہاجرہ بی بی کے فرزند کا نام اسماعیل علیہ السلام ہے، جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پہلوٹے بیٹے ہیں، باپ نے ان کو وادی میں اس جگہ آباد کیا تھا جہاں اب مکہ معظّمہ ہے، اللہ نے اسماعیل علیہ السلام کے لیے زمزم کا چشمہ ظاہر کیا تھا۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اللہ نے بارہ بیٹے دیے تھے، ان میں سے قیدار بہت مشہور ہیں، تورات میں ان کا ذکر بکثرت آیا ہے، قیدار کی اولاد میں عدنان اور عدنان کی اولاد میں قصی بہت مشہور ہیں جو چار واسطے سے نبی ﷺ کے دادا ہیں، نبی ﷺ کی ماں کا نام آمنہ ہے، جو وہب کی بیٹی ہیں، وہب قبیلہ بنوزہرہ کا سردار تھا، ان کا سلسلۂ نسب فہر الملقب بہ قریش کے ساتھ جاملتا ہے۔

اس لیے نبی ﷺ ددھیال اور ننھیال میں عرب کے بہترین قبیلہ، بہترین قوم اور شاخ میں سے ہیں، ہمارے نبی ﷺ موسمِ بہار میں دوشنبہ (سوموار) کے دن ۹ ربیع الاوّل سنہ: ۱ عام الفیل، مطابق ۲۲ اپریل ۵۷۱ء ہے، مطابق یکم جیٹھ، سنہ ۶۴۸ بکری کو مکہ معظّمہ میں بعد از صبح صادق وقبل از طلوع نیر عالم تاب پیدا ہوئے، حضور ﷺ اپنے والدین کے اکلوتے بچے تھے، والد بزرگوار کا آنحضرت ﷺ کی پیدائش سے پہلے ہی انتقال ہوگیا تھا۔

عبدالمطّلب آنحضرت ﷺ کے دادا نے خود بھی یتیمی کا زمانہ دیکھا تھا، اپنے ۲۴ سال کے نوجوان پیارے فرزند عبداللہ کی اس یادگار کے پیدا ہونے کی خبر سنتے ہی گھر میں آئے اور بچے کو خانہ کعبہ میں لے گئے اور دعا مانگ کر واپس لائے۔

محمد ﷺ نام رکھا گیا،قوم نے اس نام پر تعجب کیا:

ساتویں دن قربانی کی اور تمام قریش کو دعوت دی۔ دعوت کھا کر لوگوں نے پوچھا کہ بچے کا نام رکھا؟ عبدالمطّلب نے کہا''محمد''لوگوں نے تعجب سے پوچھا کہ آپ نے اپنے خاندان کے سب مروجہ ناموں کو چھوڑ کر یہ نام کیوں رکھا؟ کہا میں چاہتا ہوں کہ میرا بچہ دنیا بھر کی ستائش اور تعریف کا شایان قرار پائے۔

شرفاءِ مکہ کا دستور تھا کہ اپنے بچوں کو جبکہ وہ آٹھ دن کے ہوجاتے تھے، دودھ پلانے والیوں کے سپرد کر کے کسی اچھی آب وہوا کے مقام پر باہر بھیج دیا کرتے تھے۔

ایامِ رضاعت:

اسی دستور کے موافق آنحضرت ﷺ کو بھی حلیمہ سعدیہ کے سپرد کیا، وہ ہر چھٹے مہینے لاکر ان کی والدہ اور دیگر اقرباء کو دکھا جاتی تھیں، دو برس کے بعد آپ کا دودھ چھڑایا گیا، مائی حلیمہ آپ کو لے کر حضرت آمنہ کے پاس آئیں، حضرت آمنہ نے اس خیال سے کہ (وہاں کی آب وہوا حضور ﷺ کے خوب موافق تھی) شاید مکہ کی آب ہوا موافق نہ ہو، پھر مائی حلیمہ ہی کے سپرد کر دیا۔

والدہ مکرمہ کا انتقال:

جب آنحضرت ﷺ کی عمر چار برس کی ہوئی تو والدہ مکرمہ نے آنحضرت ﷺ کو اپنے پاس رکھ لیا، جب آنحضرت ﷺ کی عمر چھ برس کی ہوئی تو والدہ کا انتقال ہوگیا اور دادا نے آپ کی پرورش اور نگرانی اپنے ذمہ لی۔

جب آنحضرت ﷺ کی عمر آٹھ برس دس دن کی ہوئی تو آپ کے دادا عبدالمطّلب نے ۸۲ ر برس کی عمر میں وفات پائی۔ ابو طالب آنحضرت ﷺ کے چچا تھے اور آپ کے والد عبداللہ کے حقیقی بھائی، اب وہ آنحضرت ﷺ کی نگرانی اور تربیت کے ذمہ دار بنے۔ اکثر کتابوں میں بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ جب بارہ سال کے ہوئے تو اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ جب کہ وہ تجارتِ شام کو جا رہے تھے، سفر میں گئے۔

بحیرہ راہب کی ملاقات:

بصرہ میں بحیرہ راہب نے آنحضرت ﷺ کو پہچان لیا کہ نبی موعود یہی نوجوان ہے، چچا سے کہا کہ اسے یہودیوں کے ملک میں نہ لے جاؤ، وہ اسے پہچان کر کہیں گزند نہ پہنچائیں، شفیق چچا نے آنحضرت ﷺ کو بصرہ ہی سے واپس کر دیا۔

(۱) اِس بارے میں جو حدیث ترمذی میں ہے اس میں یہ بھی ہے کہ چچا نے واپس کرتے وقت آنحضرت ﷺ کے ساتھ بلال کو بھیجا تھا۔ ابنِ قیم رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ یہ صریح غلطی ہے، اوّل تو اس وقت بلال رضی اللہ عنہ نہ ابوطالب کے پاس تھے، نہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس، دوسرے یہ بھی ممکن ہے کہ ان دنوں موجود ہی نہ ہو۔

(۲) قرآنِ مجید کی آیت: ﴿وَ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۚ﴾ (البقرہ:۸۹) سے ثابت ہے کہ یہودی رسول موعود کے انتظار میں رہا کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس کے آنے پر یہودیوں کو کافروں پر فتح ونصرت ہوگی، یہ اعتقاد ان کا اس وقت تک رہا، جب تک کہ حضور ﷺ کی بعثت نہ ہوئی، اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ بحیرہ راہب کا قول غلط تھا؛ کیونکہ اگر یہودی اس لڑکپن میں آنحضرت ﷺ کو پہچان لیتے تو اپنے اعتقاد کے مطابق حضور ﷺ کو اپنی فتح ونصرت کا دیوتا سمجھ کر نہایت خدمت گزاری کرتے، حقیقت یہ ہے کہ راہب کی داستان ناقابلِ اعتبار ہے۔

تجارت کا خیال:

جب نبی ﷺ جوان ہوئے تو آپ کا خیال پہلے تجارت کی طرف ہوا؛ مگر گھر کا روپیہ پاس نہ تھا، مکہ میں نہایت شریف خاندان کی ایک بیوہ عورت خدیجہ رضی اللہ عنہا تھی، وہ نہایت مال دار تھی، اپنا روپیہ تجارت میں لگائے رکھتی تھی، انھوں نے آنحضرت ﷺ کی خوبیاں اور اوصاف سُن کر آپ کی سچائی، دیانت داری، سلیقہ شعاری کا حال معلوم کر کے خود درخواست کردی کہ آپ اس کے روپے سے تجارت کریں، آنحضرت ﷺ ان کا مال لے کر تجارت کو گئے، اس تجارت میں بہت نفع ہوا، اس سفر میں خدیجہ رضی اللہ عنہا کے غلام میسرہ بھی آنحضرت ﷺ کے ساتھ تھے، انھوں نے آنحضرت ﷺ کی ان تمام خوبیوں اور بزرگیوں کا ذکر خدیجہ رضی اللہ عنہا کو سنایا جو سفر میں خود دیکھی تھیں، ان اوصاف کو سن کر خدیجہ رضی اللہ عنہا نے درخواست کر کے آنحضرت ﷺ کے ساتھ نکاح کرلیا؛ حالانکہ خدیجہ رضی اللہ عنہا اس سے پہلے بڑے بڑے سرداروں کی درخواستِ نکاح کو رَد کرچکی تھی۔

نکاح:

جب یہ نکاح ہوا تو آنحضرت ﷺ کی عمر ۲۵ رسال اور خدیجہ رضی اللہ عنہا بی بی کی عمر ۴۰ رسال تھی، آنحضرت ﷺ کے نکاح میں وہ ۲۵ رسال تک زندہ رہیں، آنحضرت ﷺ ان کی وفات کے بعد بھی اکثر ان کا محبت سے ذکر کیا کرتے اور ان کی سہیلیوں سے بھی عزت اور شفقت کا برتاؤ کیا کرتے تھے۔ اس شادی کے بعد آنحضرت ﷺ کا سارا وقت اللہ کی عبادت اور بنی آدم کی بہبود وخیر اندیشی میں پورا ہوا کرتا تھا۔

ملک کی طرف سے صادق وامین کا نام آنحضرت ﷺ کو ملنا:

ایسے ہی نیک کاموں کی وجہ سے ان دنوں میں لوگوں کے دلوں پر آنحضرت ﷺ کی نیکی اور بزرگی کا اتنا اثر تھا کہ وہ آنحضرت ﷺ کو نام لے کر نہیں بلاتے تھے؛ بلکہ الصادق یا الامین کہہ کر پکارا کرتے تھے۔

آنحضرت ﷺ کی عمر ۳۵ رسال کی تھی جب قریش نے کعبہ کی عمارت کو (جس کی دیواریں سیلاب کے سبب سے پھٹ گئی تھیں) ازسرنو تعمیر کیا۔

عمارت کے بنانے میں تو سب ہی شامل تھے؛ مگر جب حجر اسود کے قائم کرنے کا موقع آیا تو سخت اختلاف ہوا؛ کیونکہ ہر ایک یہی چاہتا تھا کہ یہ کام اسی کے ہاتھ سے سرانجام پائے، چار دن تک برابر یہی جھگڑا ہوتا رہا، آخر ابواُمیہ بن مغیرہ نے جو قریش میں سب سے بڑھ کر بڑی عمر کا تھا، یہ رائے دی کہ کسی کو حَکَم بنا کر اس کے فیصلے پر عمل کریں۔

آنحضرت ﷺ کا جملہ قبائل کی طرف سے حَکَم مقرر ہونا:

اس رائے کو مانا گیا اور قرار دیا گیا کہ جو کوئی اب سب سے پہلے حرم میں آئے گا وہی سب کا حَکَم سمجھا جائے گا، اتفاقاً آنحضور ﷺ تشریف لے آئے، آنحضرت ﷺ کو دیکھنا تھا کہ هٰذَا الْأَمِيْنُ رَضِيْنَاهُ کے نعرے لگ گئے (امین آ گیا، ہم اس کے فیصلے پر سب رضامند ہیں) آنحضرت ﷺ نے اپنی زیرکی اور معاملہ فہمی سے ایسی تدبیر کی کہ سب خوش ہو گئے، آنحضرت ﷺ نے ایک چادر بچھائی، اُس پر پتھر اپنے ہاتھ سے رکھ دیا، پھر ہر ایک قبیلے کے سردار کو کہا کہ چادر کو پکڑ کر اُٹھائیں، اسی طرح اس پتھر کو وہاں تک لائے جہاں قائم کرنا تھا، آنحضرت ﷺ نے پھر اسے اُٹھا کر کونے پر اور طواف کے سرے پر لگا دیا۔

آنحضرت ﷺ نے اس مختصر تدبیر سے ایک خونخوار جنگ کا انسداد کر دیا؛ ورنہ اس وقت کے اہلِ عرب میں ریوڑ کے پانی پلانے، گھوڑوں کے دوڑانے، اشعار میں ایک قوم سے دوسری قوم کو اچھا بتانے جیسی ذرا ذرا سی باتوں پر ایسی جنگ ہوتی تھی کہ بیسیوں برس تک ختم ہونے میں نہ آتی تھی۔

قربِ زمانۂ بعثت:

بعثت سے سات برس پہلے ایک روشنی اور چمک سی نظر آنے لگی تھی، اور آنحضرت ﷺ اس روشنی کے معلوم کرنے سے خوش ہوا کرتے تھے، اس چمک میں کوئی آواز یا صورت نہ ہوتی تھی، بعثت کا زمانہ جس قدر قریب ہوتا گیا آنحضرت ﷺ کے مزاج میں خلوت گزینی کی عادت بڑھتی جاتی تھی۔

غارِ حرا میں عبادتیں کرنا:

آنحضرت ﷺ اکثر پانی اور ستو لے کر شہر سے کئی کوس دُور سنسان جگہ کوہِ حرا کے ایک غار میں جس کا طول ۴ رگز، عرض پونے دو گز تھا جا بیٹھتے اور عبادت کیا کرتے، اس عبادت میں تحمید و تقدیس الٰہی کا ذکر بھی شامل تھا اور قدرتِ الٰہیہ پر تدبر و تفکر بھی، جب تک پانی اور ستو ختم نہ ہو جاتے شہر میں واپس نہ آیا کرتے، اب آنحضرت ﷺ کو خواب نظر آنے لگے، خواب ایسے سچے ہوتے تھے کہ جو کچھ رات کو خواب میں دیکھ لیا کرتے دن میں وہ ویسا ہی ظہور میں آجاتا۔

(جاری.....)

❑❖❑

حیات قطبِ دکنؒ

از:

مولانا سعید الحق صاحب قریشی

اودگیر پر ایک تاریخی نظر

اودگیر سطح زمین سے بلندی پر واقع ایک بہت ہی پُرانی بستی ہے، آزادی سے قبل یہ بیدر ضلع کا ایک تعلقہ ہوا کرتا تھا، اب یہ تعلقہ لاتور ضلع میں شمار کرلیا گیا ہے، یہاں کے رہنے والوں کا ماننا ہے کہ یہ بستی تقریباً آٹھ سو سال پُرانی ہے، ہوسکتا ہے کہ ان کی یہ بات کافی حد تک درست ثابت ہو؛ کیونکہ اس شہر میں کئی ایسی قدیم عمارتیں موجود ہیں جو آج کھنڈرات میں تبدیل ہوچکی ہیں، ان کی اصل شکل کا اندازہ لگانا بے انتہا مشکل ہے، یہاں ایک قلعہ بھی ہے، تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ قلعہ برید شاہی سلطنت میں تعمیر کیا گیا تھا اور کچھ فارسی دستاویزات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قلعہ بہمنی سلطنت میں بنایا گیا تھا؛ لیکن اس قلعہ کے بہمنی سلطنت میں بنائے جانے کے ٹھوس ثبوت نہیں ملتے۔ ۱۵۰۳ء میں جب قاسم برید بیدر کا بادشاہ بنا تو اس نے اپنے بیٹے امیر برید کو یہ قلعہ سپرد کیا تھا۔

اودگیر نام رکھنے کی وجہ

کہا جاتا ہے کہ ایک برہمن فقیر نے یہاں ایک چھوٹی جھونپڑی ڈالی تھی، چند دنوں بعد آبادی بڑھنے لگی اور یہ ایک بستی بن گئی؛ لہٰذا اس برہمن فقیر کے نام پر اس بستی کا نام اودگیر رکھا گیا۔

صوفیاء و مصلحین کی آمد

ابتداء ہی سے یہ شہر علماء وصوفیاء کی آماجگاہ رہ چکا ہے، دکن کے کئی صوفیاء نے اس جگہ کو تبلیغ دین کے لیے اپنا مرکز بنا رکھا تھا، جن میں سرفہرست حضرت خواجہ عثمان ہارونی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ حضرت خواجہ صدرالدین باشاہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے پیر بھائی حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے ہندوستان آنے سے قبل اپنے مریدین واہلِ خانہ کے ساتھ یہاں تشریف لے آئے اور تاحیات اس مقام کو اپنے فیوض و برکات سے سیراب کرتے رہے۔

اسی طرح حضرت میر موسیٰ قادری، حضرت سیّد چاند صاحب قادری، حضرت شاہ محمد صاحب قادری حضرت شاہ داؤد باشاہ افغانی رحمہم اللہ تعالیٰ اور دیگر کتنے اہل اللہ نہ جانے یہاں اسلام کے جھنڈے گاڑنے کے بعد اپنے مقبروں میں چین وسکون کی نیند سو رہے ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ ان کی پاکیزہ روحوں کو سرسبزی وشادابی بخشے۔

غرض یہ ہے کہ کسی دَور میں بھی یہ بستی اہل اللہ اور مصلحین سے خالی نہیں رہی۔

صوفیاء کون ہیں؟

خیرالقرون میں صحابی، تابعی، تبع تابعی، اہلِ حق کے امتیاز کے لیے کافی القاب تھے، پھر ان میں سے خواص کو زہّاد، عُبّاد کہا جاتا تھا، پھر جب شرور وفتن اور بدعات کا دَور دَورہ شروع ہوا، تو گمراہ لوگ بھی اپنے کو زہّاد، عبّاد کہنے لگے، اسی وقت امتیاز کے لیے اہلِ حق نے صوفی کا لقب اختیار کرلیا اور دوسری ہی صدی میں اس لقب کی شہرت ہوگئی۔ اصطلاح میں سادگی اور اُصول کی پابندی کے ساتھ تصوف کی راہ پر چلنے والے، پاکیزہ نفس، قربِ الٰہی کی راہ پر چل کر اخلاقی وروحانی بلندیوں کو حاصل کرنے والے شخص کو صوفی کہا جاتا ہے۔

صحبتِ اہل اللہ کی اہمیت

ابتدائے آفرینش عالم ہی سے اللہ رب العزت نے اپنے بندوں کی ہدایت ورہنمائی کے لیے اپنے مخلص بندے انبیاءؑ ورُسلؑ کو بھیجتا رہا اور یہ سلسلہ نبی آخرالزماں محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم پر آکر ختم ہوگیا، اب کوئی نبی اور رسول نہیں آسکتا، تاقیامت آپؐ ہی کی تعلیمات چلتی رہیں گی۔

رب العالمین نے جہاں اپنے بندوں کی رہنمائی کے لیے آسمانی کتب اور شریعت کو نازل فرمایا وہیں اپنے برگزیدہ بندوں کو ان کے لیے اُسوہ اور نمونہ بنایا اور شریعت وصحائف سے زیادہ رجال اللہ کا انتخاب کیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ کتاب اللہ کو سمجھنے کے لیے رجال اللہ کی ضرورت پڑتی ہے، اگر صرف تلاوتِ قرآن سے اصلاح ہوجاتی تو اللہ تعالیٰ نبیوں کو ہرگز مبعوث نہ فرماتا اور قرآنِ کریم میں تزکیۂ نفس کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نہ کی جاتی، ارشادِ باری ہے، جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا ذکر کیا گیا ہے:

﴿رَبَّنَا وَ ابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۱۲۹﴾ (سورۂ بقرہ، پارہ:۱)

ترجمہ: ''اے ہمارے پروردگار! ان (باشندگانِ مکہ) میں انہی لوگوں میں سے ایک ایسا رسول

مبعوث فرما جو ان پر تیری آیتوں کی تلاوت کرے، انھیں کتاب وحکمت کا علم سکھائے اور ان (کے نفوس) کا تزکیہ کرے۔''

کتاب اللہ پر عمل کرنے کے لیے ہمت کی ضرورت ہوتی ہے یہ ہمت بھی مردانِ خدا کے سینوں سے عطا ہوتی ہے، اگر نبی وقت زندہ ہیں تو نبی کے سینہ سے اگر نبی وقت دنیا سے تشریف لے جا چکے ہیں تو ان سے فیض پانے والے نائبین انبیاء کے سینوں سے یہ قوت منتقل ہوتی ہے۔ جن لوگوں نے اللہ والوں کو چھوڑ کر اپنے ذہن سے کتاب اللہ کو سمجھنا چاہا، وہ خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا؛ اس لیے کہ باری تعالیٰ نے صراطِ مستقیم پر گامزن افراد کی جو نشان دہی سورۂ فاتحہ میں کی ہے اس کو انھوں نے فراموش کر دیا، وہاں صرف کتاب اللہ کو اپنانے والوں کو صراطِ مستقیم پر چلنے والا قرار نہیں دیا گیا؛ بلکہ ان بندوں کو نمونہ اور اُسوہ قرار دیا گیا جن پر اللہ نے اپنا انعام نازل فرمایا ہے، اس سے پتہ چلا کہ مطلقاً کتاب اللہ کو ماننے کا جو دعویٰ کرے وہ بھی صراطِ مستقیم پر قائم نہیں ہوسکتا اور جو صرف اللہ والوں کو اپنانے کا دعویٰ کرے، ہدایت یافتہ لوگوں میں اس کا شمار نہیں ہوگا؛ بلکہ کتاب اللہ کے ساتھ اہل اللہ کی بھی اہمیت ہے؛ اسی لیے قرآن کہتا ہے:

﴿وَ اَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ﴾ الخ (سورۂ نحل، پارہ: ۱۴، آیت: ۴۴)

ترجمہ: ''بلاشبہ ہم نے قرآنِ کریم کو نازل کیا؛ تاکہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) لوگوں کو بتلائیں کہ (اُن کے لیے) کیا نازل کیا گیا ہے۔''

اس آیتِ مبارکہ سے پتہ چلتا ہے کہ صرف کتاب اللہ کے نزول کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے بندوں کی ہدایت کے لیے کافی نہیں سمجھا؛ بلکہ آپ علیہ السلام کو حکم دیا کہ لوگوں کو بتلائیں پروردگار ان سے کیا چاہتا ہے۔

اسی لیے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے: ہم حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ سے مسئلہ پوچھنے کے لیے بیعت نہیں ہوئے؛ بلکہ مسئلہ تو وہ ہم سے پوچھیں گے؛ لیکن ہم نے جو کچھ پڑھا ہے اس پر عمل کرنے کے لیے توفیق اور ہمت چاہیے، یہی توفیق وہمت حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سینہ سے لینے کے لیے ہم ان سے بیعت ہوئے ہیں۔

چنانچہ اسی بنیاد پر بڑے بڑے اہلِ علم نے اہل اللہ سے اپنا تعلق جوڑا؛ تاکہ نفس مٹ جائے اور مٹنے کے بعد انھیں مقبولیت عطاء ہوئی، قیامت تک اللہ نے ان کے نام کو زندہ رکھا۔

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یہ نعمت صوفیاء کے اندر خاص ہوتی کہ بزرگوں کی صحبت میں رہ کر اپنے نفس کو مٹاتے چلے جاتے ہیں، بہت کچھ ہوتے ہوئے بھی خود کو کچھ نہیں سمجھتے اور زبانِ حال سے یہ بیان کرتے ہیں۔

کچھ ہونا مِرا ذلت و خواری کا سبب ہے
یہ ہے میرا اعزاز کہ میں کچھ بھی نہیں ہوں
ہم خاک نشینوں کو نہ مسند پہ بٹھاؤ
یہ عشق کی توہین ہے اعزاز نہیں ہے

ایک حدیث پاک میں بتلایا گیا کہ پورے زمانے میں قیامت تک اللہ تعالیٰ کی تجلیات برستی رہیں گی:

إِنَّ لِرَبِّكُمْ فِيْ أَيَّامِ دَهْرِكُمْ نَفْحَاتٍ. (المعجم الكبير للطبراني)

''تمہارے رب کی طرف سے تمہارے زمانہ کے دن ورات میں خدا تعالیٰ کی تجلیات برستی رہتی ہیں''۔

یہ تجلیات جن سے اللہ اپنے بندوں کو جذب کرتا ہے ان کو تلاش کرتے رہو، اگر کوئی تجلی تمہیں حاصل ہوجائے تو پھر تم کبھی شقی نہیں ہوسکتے؛ مگر ان کا مکان کہاں ہے؟ اس کو دوسری حدیث میں بیان فرمایا:

هُمْ رِجَالٌ لَايَشْقىٰ جَلِيْسُهُمْ. (مسلم بالمعنیٰ)

''کہ اللہ والوں کی صحبت میں بیٹھنے والا کبھی بدبخت نہیں ہوسکتا''

تجلیاتِ ربانی انہی کے پاس جذب ہوتی ہیں اور انہیں کی صحبت سے ملتی ہیں، اس کو قرآنِ کریم نے فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ (سورۂ توبہ، پارہ:۱۱)

''اے ایمان والو! تقویٰ اختیار کرو اور اہل اللہ کی صحبت میں رہو''

اسی کی تفسیر روح المعانی میں علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے کی ہے: خَالِطُوْهُمْ لِتَكُوْنُوْا مِثْلَهُمْ سے یعنی اتنا زیادہ اہل اللہ کے ساتھ رہو کہ انہی جیسے بن جاؤ جیسے ان کی اشک بار آنکھیں ہیں ہمیں بھی وہ آنسو مل جائیں، جیسے درد بھرے دل سے ان کے سجدے ہوتے ہیں ہمیں بھی وہ سجدے نصیب ہوجائیں، وہ ساری نعمتیں ہمیں بھی میسر ہوں جو اللہ والوں کو نصیب ہیں اور ولایت کا طریق، سلوک کا راستہ آسان سے آسان تر ہوتا چلا جائے اور اس راستے کے راہی کو ایک خاص قسم کی لذت محسوس ہونے لگے، جیسے کسی شاعر نے کہا ہے ؎

مجھے سہل ہوگئیں منزلیں کہ ہوا کہ رُخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ ہاتھ میں جو آ گیا تو چراغ راہ کے جل گئے

❑❖❑

مسئلہ مقصودیت معنیٰ

ازقلم:
حضرت مولانا شاہ محمد عبدالغفور قریشی نوراللہ مرقدہٗ

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ بْنِ الْعَاصِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اَلْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللهُ عَنْهُ. (اخرجه الخمسة)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ ﷺ نے: کہ مہاجر (حقیقی) وہ شخص ہے جو ترک کرے اُن اُمور کو جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔

(روایت کیا اِس کو بخاری و مسلم و ترمذی و ابوداؤد و نسائی نے)

حضرات صوفیہ رحمہم اللہ کا ارشاد ہے کہ: ''ظاہر بدون باطن کے قابلِ اعتبار نہیں'' اور مقصود اعمال سے ان کے حقائق و معانی ہیں۔ اِس حدیث میں صاف دلالت ہے کہ اگر کوئی شخص ظاہراً ہجرت کرے؛ مگر جو اصلی غرض ہے ہجرت سے کہ نامرضیات حق سے کنارہ کرنا، اس کا اہتمام نہ کرے تو وہ حقیقتاً مہاجر نہیں؛ لیکن اس سے کوئی یہ نہ سمجھ جائے کہ ظاہر محض غیر مقصود ہے، اصل یہ ہے کہ ہر باطن کے لیے جو ظاہر شریعت نے تجویز کیا ہے بدوں اس ظاہر کے وہ باطن حاصل ہی نہیں ہوسکتا۔

وضاحت: اسلام دو پہلو رکھتا ہے: ظاہر اور باطن، ان دونوں میں اصل باطن ہے اور ظاہر اس کے تابع ہے، دونوں کی درستی پر ہی تکمیل کا درجہ دیا جاتا ہے، دونوں کا ایک دوسرے سے لازمی تعلق ہے، گویا دونوں لازمی ہونے میں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوسکتے۔

دنیا میں بعض لوگ باطن کو جانتے ہی نہیں؛ اِس لیے صرف ظاہر پر اکتفا کرتے ہیں اور ناتمام و ناکام رہتے ہیں اور بعض محض باطن ہی کو اہم قرار دے کر ظاہر کو چھوڑ دیتے ہیں، یہ بھی ناتمام و ناکام ہیں، دونوں کو ملانے والے کامیاب اور کامل ہیں۔

اب باطن کی طرف توجہ کیجیے دل کا اللہ تعالیٰ سے مضبوط علاقہ جوڑنا، اللہ کی پہچانت اور اس سے محبتِ کامل پیدا کرنا اور دل سے ماسوی اللہ کا نکل جانا، خالص اللہ کا تعلق ہی قائم رہ جانا، دل سے غیر کی محبت نکل جانا اور اللہ ہی کی محبت باقی رہ جانا، اس کے لیے پیرانِ طریقت دل سے ذکر اللہ کی سخت محنت لیتے ہیں اور دل میں اللہ کی

محبت باقی رہ جانا، اس کے لیے پیرانِ طریقت دل سے ذکر اللہ کی سخت محنت لیتے ہیں اور دل کو پُرنور بناتے ہیں اور دل کو آئینۂ جمالِ خداوندی بنادیتے ہیں، یہی تو باطن ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان کی زندگی کے لیے یہی اصل ہے کہ دل غیر اللہ سے چھوٹ کر اللہ سے معمور ہوجائے۔ اس میں ایک خاص فائدہ یہ ہوتا ہے کہ دل میں نورانیت آنے سے نفس کی کدورتیں، رِیا، بغض، بخل، حسد، کینہ، حبِّ جاہ، وحبِّ مال، وخواہشاتِ نفس نکل جاتے ہیں۔ یہ بُری خصلتیں آدمی کو برباد کردیتی ہیں، نیکیوں کو ملیامیٹ کردیتی ہیں، ان باطنی خباثتوں کا دُور کرنا انسان پر فرض ہے، اسی کی طرف حضور ﷺ نے اشارہ فرمایا ہے کہ مہاجر (حقیقی) وہ شخص ہے جو ترک کرے ان اُمور کو جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔

گناہوں کو چھوڑنا اصل ہے۔ صوفیائے کرام کا منشاء یہ ہے کہ باطن جیسا بننا چاہیے بن جائے تو خود بخود گناہ بھی چھوٹ جائیں گے، اور اعمال ظاہر جیسا بننا ہے بن جائیں گے؛ ورنہ اگر باطن نہ بنے تو محض اعمالِ ظاہر کا بننا دشوار ہے، ایسے اعمال ظاہر کا اعتبار نہیں کہ کب چھوٹ جائیں گے اور کب بدل جائیں گے، جن اعمال ظاہر میں ان کی اصل وروح، تعلق مع اللہ ہی نہ ہو تو ایسے اعمالِ ظاہر کا کیا اعتبار۔

اعمالِ ظاہر نتیجہ ہیں باطن کا، باطن خراب تو ظاہر بھی خراب، باطن روشن تو ظاہر بھی روشن، باطن جس قدر قوی تو ظاہ بھی اسی قدر قوی۔ باطن جس قدر اُونچا، ظاہر بھی اسی قدر اونچا، باطن کو اللہ تعالیٰ سے جس قدر تعلق ظاہر کو بھی اس کے ساتھ اسی قدر اللہ سے تعلق، باطن جس قدر پاک ظاہر بھی اسی قدر پاک۔ باطن میں جس قدر اللہ سے محبت، ظاہر بھی اسی قدر محبت بھرا، باطن کو اللہ کا جس قدر عرفان نصیب، ظاہر بھی اسی قدر عرفان میں ڈوبا ہوا، باطن کو اللہ تعالیٰ کا جس قدر قرب نصیب، ظاہر بھی اسی قدر قرب والا، باطن کو جس قدر اللہ کا وصل نصیب، ظاہر بھی اسی قدر وصل والا، باطن کو جس قدر اللہ تعالیٰ کی رضا نصیب ظاہر بھی اسی قدر رضا پایا ہوا، باطن جس قدر عنداللہ قیمتی، ظاہر بھی اسی قدر قیمتی اور باطن جس قدر کمزور، ظاہر بھی اسی قدر کمزور، باطن جس قدر خالی، ظاہر بھی اسی قدر خالی، باطن جس قدر تاریک، ظاہر بھی اسی قدر تاریک؛ اِس لیے:

صحابۂ کرامؓ کا جس قدر باطن روشن قیمتی اور قوی تھا، ان کا ظاہر بھی اسی قدر روشن قیمتی اور قوی تھا، اسی طرح اولیاء اللہ کا جس قدر باطن اللہ کا قرب پایا ہوا ہوتا ہے ظاہر بھی ان کا اسی قدر قرب پایا ہوا ہوتا ہے، اللہ والوں کے باطن کو جس قدر برکت واثر وکرامت حاصل رہتی ہے، ان کے ظاہر کو بھی اسی قدر برکت اثر اور کرامت حاصل رہتی ہے۔ ہمارا باطن جس قدر تاریک ہے اسی قدر ہمارا ظاہر بھی تاریک ہے؛ اِسی لیے صوفیائے کرام کا فرمانا ہے کہ ظاہر بدوں باطن کے قابلِ اعتبار نہیں، اور مقصود اعمال ہے، ان کے حقائق اور معانی ہیں (یعنی باطن) آج

سارا عالم باطن سے خالی ہے؛ اِسی لیے سارے عالم کا ظاہر بے اثر اور تاریک ہے۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم تھوڑے تھے، سارے سالم پر بھاری تھے، آج ہم سارے عالم پر ہیں؛ مگر ذلیل وخوار ہیں، بعض لوگ باطن کو جانتے ہی نہیں؛ بلکہ مانتے ہی نہیں، صرف ظاہر ہی کو کافی سمجھتے ہیں اور اسی پر اکتفا کیے ہوئے ہیں، یہ بیچارے باطن کی لذتوں اور مسرتوں سے اور برکتوں سے محروم ہیں، جس کمال باطن پر نجات یقینی ہے، اسی یقینی نجات سے محروم ہیں، دغدغے میں پڑے ہوئے ہیں، باطنی یقین پایا ہوا، اللہ کے دیے ہوئے اطمینان سے مطمئن ہے، اس سے یہ بے چارے محروم ہیں، دونوں جہاں میں غیر مطمئن ہیں؛ حالانکہ سارے انبیاء علیہم السلام وسردارِ انبیاء علیہ السلام اور سارے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور سارے اولیاءِ کرام باطن سے پُر ہیں، اور ان بے چاروں کو اس باطن کی ہوا بھی نہیں لگی اور لذتِ ایمان سے محروم ہیں، معاملہ یہاں تک ہوتا ہے کہ اللہ نے جو چاہا انہوں نے وہی چاہا اور انھوں نے جو چاہا اللہ نے بھی وہی چاہا، اس دوطرفہ چاہت کے اَن گنت واقعات ظاہر میں عالم بھر میں بھرے پڑے ہیں، ایک اللہ والا جیسے تمام عالم کی ضرورت کو منا لیتا ہے اور عالم اس ضرورت سے بہرہ ور ہو جاتا ہے، یہ بیچارے منہ تکتے ہی رہ جاتے ہیں، یہ اللہ سے کچھ منا نہیں سکتے، یہ بے چارے اپنے ہی حال میں پریشان ہیں، دوسرے کے کام اللہ سے کیا بنائیں گے، یہ خود اللہ سے جاہل ہیں دوسروں کو کیا نبھائیں گے، سارے دین واسلام کی تعلیم تو یہ تھی کہ اپنے باطن کو اللہ سے جوڑیں؛ تاکہ ظاہر بھی اللہ سے جُڑ جائے یہ بے چارے ظاہر ہی ظاہر میں ہیں؛ اِس لیے یہ حال ہو گیا ہے کہ ''نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم'' نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے۔

صاحبِ باطن کے کام اللہ خود بناتے ہیں، یہ بے چارے اپنا کام خود نہیں بنا سکتے، صاحبِ باطن کی نمازیں، روزے اور ساری عبادتیں جانی ہوں یا مالی سب باطن میں ڈوبی ہوئی اور ان اہلِ ظاہر کے سارے کام باطن سے خالی، ان کے باطن کو اللہ ہی سے تعلق نہیں تو ان کے ظاہر کو اللہ سے کیا تعلق ہوگا، نہ دل کو تعلق اور نہ عمل کو تعلق، اہلِ باطن کی نمازیں اللہ کے حضور میں اور محض اہلِ ظاہر کی نمازیں بے حضور؛ اِسی لیے حدیث پاک میں فرمایا گیا ہے کہ ''بے دلی اور بے حضور کی نمازیں حشر میں اس کے منہ پر پھینک دی جائیں گی'' اور صاحبِ باطن کا عمل اللہ کے پاس قبول اور بے حساب جنت میں جانے کے قابل بنا دے گا۔

میاں عاشق و معشوق رمزیست
کراماً کاتبین را ہم خبر نیست

اب ایک طرف اور بھی توجہ فرمائیے کہ بعض لوگوں کو باطن کا ایسا دعویٰ ہوتا ہے کہ وہ ظاہر کو بالکل بے سود،

بے فائدہ اور قابلِ ترک سمجھتے ہیں، نماز بھی دل کی پڑھتے ہیں، پڑھتے کیا ہیں جھوٹ کہتے ہیں اور نماز پڑھنے کو بے کار سمجھتے ہیں، یہ لوگ گمراہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ہم کو عالمِ باطن سے عالمِ ظاہر میں بھیجا ہے؛ تاکہ ظاہر اور باطن کو ملا کر ہم اللہ کی عبادت کریں، عالم ظاہر میں آکر ہم نہ صرف ظاہر ہی ظاہر میں رہیں اور نہ اپنے آپ کو اہلِ باطن سمجھ کر ظاہر کو چھوڑ دیں، اگر ظاہر کو چھوڑنا ہی تھا تو باطن ہی میں رہتے، ظاہر میں کیوں آئے اور اگر ظاہر ہی میں رہنا تھا تو باطن سے ظاہر میں کیوں آئے، سارے انبیاء علیہم السلام اور سردارِ انبیاء علیہم السلام نے یہی تعلیم دی کہ دنیا میں آنے سے پہلے جیسے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے حضور عالمِ باطن میں تھے، اب عالمِ ظاہر میں آنے کے بعد اپنے ظاہر میں اس عالم باطن کی اللہ کی حضوری کو نہ بھولیں۔ ہمارا ظاہر کا سارا عمل اللہ کی حضوری میں ہو، سارے انبیاء علیہم السلام نے انسانوں کے جہاں باطن کو اللہ سے جوڑا وہاں تمام ظاہری وہ اعمال جن کو یہاں عالم ظاہر میں کرنے کے تھے، ان کو سکھلائے؛ تاکہ ہر عمل ظاہر باطن سے جُڑ جائے؛ ورنہ انبیاء اور سردارِ انبیاء علیہم السلام کو دنیا میں آنے کی کیوں تکلیف دی جاتی، یاد رکھیے! کہ تمام شرعی اُمور وہ ہیں جن کو اللہ کی محبت میں کرنا ہے، بغیر ان اعمالِ شرعی کے اللہ کی محبت ہی نہیں ہوسکتی اور بغیر اعمالِ شرعی کے باطن بن ہی نہیں سکتا، بغیر نماز پڑھے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت اور تعلق بن ہی نہیں سکتا، جو شخص بغیر نماز پڑھے اللہ کی محبت کا دعویٰ کرے، وہ جھوٹا ہے، کذّاب ہے، مردود ہے، تمام اعمالِ شرعی اللہ کی محبت کا برتن ہیں اور بغیر برتن کے چیز رکھی ہی نہیں جاسکتی۔

شرع کے دو پہلو ہیں: ایک باطن (تعلق مع اللہ) دوسرے ظاہر، جس سے باطنی تعلق مع اللہ کا اظہار ہو؛ اِس لیے محض باطن بھی کوئی چیز نہیں ہے اور بغیر باطن کے ظاہر کا بھی اعتبار نہیں ہے؛ اِس لیے حضرت نے فرمایا کہ اس سے کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ ظاہر محض غیر مقصود ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہر باطن کے لیے جو ظاہر شرع نے تجویز کیا ہے بدوں انس ظاہر کے وہ باطن حاصل ہی نہیں ہوسکتا۔ حضرت کا ظاہر کی اہمیت بیان کرنے میں کمال ہے کہ ظاہر کو کسی قیمت پر گرنے، قدر و منزلت میں کم ہونے نہیں دیا، کہ جس قدر باطن اہم ہے ظاہر بھی اسی قدر اہم ہے؛ بلکہ باطن کے بغیر ظاہر حاصل ہی نہیں ہوسکتا، اس پر یہ طرز کہ شرع نے ہر باطن کے لیے اس کا ظاہر تجویز کیا؛ اسی لیے ظاہر شرع آتی ہے؛ ورنہ شرع کے آنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اور اس پر زور باندھا ہے کہ بغیر اس تجویز شدہ ظاہر کے باطن حاصل نہیں ہوسکتا، ظاہر کی اہمیت کو حضرت نے مکمل کر دیا، اور شرع نے ظاہر کو جو مقام دیا ہے وہ اس کو مقام دے دیا۔ حضرت نے بتلا دیا کہ حضور ﷺ کی شریعت کس قدر اہمیت رکھتی ہے کہ اس کے بغیر آدمی راہِ حق، راہِ خدا پا ہی نہیں سکتا، لوگ یا تو صرف باطن میں پڑے ہوئے ہیں اور ایسے بہت کم ہیں، یا صرف ظاہر

میں پڑے ہوئے ہیں، اور ایسے تقریباً سب ہی ہیں، حضرت نے دونوں کو جوڑنے اور ملانے اور دونوں کو قیمتی بنانے کا حق ادا کیا ہے اور شارع علیہ السلام کا جو منشاء تھا اس کو پورا کر دیا۔

اکابرینِ دارالعلوم دیوبند جیسے باطن میں کامل درجے کمال رکھتے ہیں، اسی طرح ظاہر میں بھی کامل درجہ کمال رکھتے ہیں، نہ باطن کو گرنے دیتے ہیں اور نہ ظاہر کو کم ہونے دیتے ہیں۔ **فجزاهم الله خير الجزاء.**

آخر میں ایک بات یاد رکھیے! کہ باطن کو پیر کامل باشرع سے لیجیے اور ظاہر اہلِ شرع علماء سے لیجیے اور جو ظاہر و باطن دونوں میں کمال رکھتے ہوں وہ تو نورٌ علیٰ نور ہیں، الحمدللہ اکابرین دارالعلوم دیوبند نورٌ علیٰ نور ہی ہیں۔

ایک اور بات کا بھی خیال رکھیے کہ بعض لوگ باطن کو شرع سے الگ کر دیتے ہیں اور ایسے ایسے طریقے اور رِواجات اور رسومات چلاتے ہیں جن کو ظاہر شرع سے تعلق نہیں اور گمراہی پھیلاتے ہیں۔ باطن وہی ہے جس کا ظاہر شرع میں داخل ہو، بعض لوگ ظاہر شرع میں ایسے رِواجات اور رسومات کو لگا دیتے ہیں، جن کا داخلہ ظاہر شرع میں نہیں ہے، وہ شریعت کو بگاڑتے ہیں، صرف یہ کہہ کر کہ ایسا کرنے میں کیا حرج ہے؟ خیال رکھیے! کہ ایسے رواجات و رسومات عام لوگوں میں داخل دین بن جاتے ہیں جو دین اور حکم نہیں ہیں، جو دین کو بگاڑتا ہے، ایسے بگاڑ کی ذمہ داری اور بگڑنے والوں کی ذمہ داری بگاڑنے والوں پر رہے گی اور دین و شرع محمدیؐ کے بگاڑنے والوں سے حضور ﷺ سخت ناراض ہیں، فرماتے ہیں ایسوں کا ٹھکانہ جہنم ہے؛ کیونکہ شرع محمدیؐ کو تا قیامت جوں کا توں رہنا ہے؛ اِسی لیے علماءِ شرع، شرع میں بال برابر نہ کمی ہونے دیتے ہیں اور نہ زیادتی ہونے دیتے، اسی مقصد میں جاہلوں اور گمراہوں سے تکلیف اُٹھاتے ہیں؛ مگر بال برابر بھی شرح محمدیؐ میں کمی زیادتی ہونے نہیں دیتے، حضور ﷺ کی شرع کو تا قیامت جوں کا توں رہنا ہے اور رکھنا ہے، یہی دین کی حفاظت اور اس کا اجر و ثواب، علماءِ شرع اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے آخرت میں پائیں گے اور شریعتیں منسوخ ہوگئیں، اب ایک ہی شریعت جس کو رسول ﷺ نے لایا ہے، تا قیامت رہے گی اور علماءِ شرع اس کے محافظ ہیں۔

خیال فرمایئے کہ ہر زمانے اور ملک میں رسومات اور رواجات پیدا ہوتے رہے اور پیدا ہوتے رہیں گے، مٹتے بھی رہے ہیں اور مٹتے بھی رہیں گے، نہ مٹنے اور نہ بدلنے والی وہ ایک ہی چیز شرعِ محمدی ہے، جس کے ذمہ دار علماء حضرات ہیں۔

الحمدللہ علماءِ دیوبند نے اس کا پورا پورا حق ادا کیا ہے اور کرتے رہیں گے کہ غیر دین اور رسم و رواج جن کو لوگ دین سمجھ کر کرتے ہیں، نہ اس میں فائدہ ہے اور نہ اجر و ثواب اور نہ مقبولیت اور نہ وہ شرعِ محمدیؐ میں ہیں الگ کر دیا۔

جولوگ دین میں زائد چیز کررہے ہیں وہ محض مشقت میں پڑ رہے ہیں، اس میں نہ اجر ہے اور نہ ثواب؛ بلکہ اُلٹا عذاب ہے، شرع محمدی انسانوں کے لیے کافی اور مکمل ہے، نہ اس میں کمی کرنا ہے اور نہ زیادتی، شرع محمدی کو جُوں کا تُوں رکھنا ہی بڑا کمال اور اجر وثواب کا باعث ہے۔

حضرت تھانویؒ نے سلوک میں کمی زیادتی کو دُور کرنے کے لیے جس قدر پیرانِ طریقت کے اذکار ومعاملات کو کہ جن کا داخلہ شرع وحدیث میں ہے، احادیث سے بتلانے کے لیے **حقیقة الطریقة من السنة الأنیقة** کتاب ڈیڑھ سو صفحات پر تصنیف کی ہے اور سلوک کو حدیث سے مستند کردیا ہے اور کمی زیادتی سے صاف کردیا ہے، اللہ تعالیٰ حضرت کو جزائے خیر عطا فرمائے اور ان کے درجات کو بلند کرے، آمین یارب العالمین۔

نوٹ: مسلمان کو صاحبِ باطن ہونا چاہیے اور اس کی محنت بھی کرنی چاہیے؛ لیکن ظاہراً نماز کو بھی نہیں چھورنا چاہیے، ممکن ہے اللہ اس ظاہر کو قبول فرمالیں، اس میں نہ زیادہ نہ سہی تکبیر تحریمہ کی نیت تو ہے، شاید اللہ اس جز کو کل بنادیں، اگر مسلمان اتنا بھی نہ کرے تو وہ سخت گنہگار ہے۔

شرک کی قباحت اور اس کے اقسام

از قلم:
مولانا محمد فضیل قریشی قاسمی

قَالَ اللّٰہُ تَعَالیٰ: ﴿لَا یَدۡخُلُوۡنَ الۡجَنَّۃَ حَتّٰی یَلِجَ الۡجَمَلُ فِیۡ سَمِّ الۡخِیَاطِ ؕ﴾ (الاعراف:۴۰)

ترجمہ: (مشرکین) جنت میں داخل نہیں ہوں گے یہاں تک کہ اُونٹ سوئی کے ناکے میں داخل ہوجائے، یعنی کبھی داخل نہیں ہوسکیں گے۔

شرکت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کوئی چیز دو یا دو سے زیادہ افراد کے درمیان ہو، کسی ایک فرد کی تنہا ملکیت نہ ہو۔

لیکن چونکہ شرک یہ توحید کی ضد ہے اور توحید کے مخالف ہے؛ اِس لیے توحید کی تعریف ہی سے شرک کی وضاحت بھی خود بخود ہوجاتی ہے؛ لہٰذا شرک کا مطلب یہ ہوگا کہ مجوسیوں یعنی آگ کی پوجا کرنے والوں کی طرح اللہ کی ذات میں کسی کو شریک کرنا یا بُت پرستوں کی طرح اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کو عبادت کا مستحق ٹھہرانا، کسی کو خالق کے مشابہ بنادینا یا مخلوق کو خالق کے ساتھ تشبیہ دینا۔

توحید اور دیگر عقائد کا محل انسان کا دل ہے، تو اس کی مخالف صفت کا محل بھی دل ہی ہوگا؛ لہٰذا اگر کوئی شخص اپنے دل میں یہ یقین رکھتا ہے کہ اللہ کی ذات میں یا صفات میں یا اس کے افعال میں کوئی شریک ہے تو وہ مشرک کہلاتا ہے، چاہے عملی طور پر زبان سے یا اپنے عمل سے اس کا اقرار واظہار کرے یا نہ کرے، بہرصورت وہ عنداللہ مشرک قرار پائے گا۔

شرک کی ابتداء

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی زندگی میں شرک کا وجود نہیں تھا؛ بلکہ آپؑ کی اولاد میں یہ سلسلہ شروع ہوا؛ چنانچہ روئے زمین پر جس قوم نے سب سے پہلے شرک کا ارتکاب کیا وہ نوح علیہ السلام کی قوم تھی۔

قرآنِ کریم نے بیان فرمایا ہے کہ نوح علیہ السلام کی قوم نے پانچ بتوں یعنی: ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر کی پرستش شروع کی۔

بخاری کتاب التفسیر میں حضرت عبداللہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا گیا ہے کہ یہ اس قوم کے پانچ نیک افراد تھے، جب ان کا انتقال ہوا تو شیطان نے قوم کو یہ ترکیب سکھلائی کہ جن مجالس میں یہ لوگ بیٹھا کرتے

تھے وہاں ان کے نام پر بُت نصب کریں؛ تا کہ ان کو دیکھ کر ان ہی کی طرح نیکی اور پارسائی پر جمے رہیں؛ چنانچہ لوگوں نے ایسا ہی کیا؛ لیکن انھوں نے ان بتوں کی عبادت نہیں کی، اس کے بعد جب نصب کرنے والے افراد کا بھی انتقال ہوگیا اور لوگوں کی نظروں سے یہ بات اوجھل ہوگئی کہ ان کے بڑوں نے کسی لیے ان بُتوں کو نصب کیا تھا، تو اس کے بعد بذاتِ خود ان بتوں کی عبادت ہونے لگی۔

اہلِ عرب ابتداءً بُتوں کی پوجا نہیں کرتے تھے؛ بلکہ وہ حضرت ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کے دین پر قائم تھے، عمرو بن لحیٰ بن غالوشہ بن عمرو بن عامر پہلا وہ شخص ہے جس نے عرب کے اندر بُت پرستی کی بنیاد رکھی اور یہ رواج چل پڑا۔

شرک کی اقسامِ ثلاثہ

توحید کی طرح شرک کا خلاصہ بھی تین قسموں میں منحصر ہے:

(۱) شرک فی الذات: یعنی اللہ کے علاوہ کسی کو قدیم ماننا یا خالق یا رازق یا نفع ونقصان کا مالک سمجھنا، جس کی سورۂ اخلاص میں صراحتاً نفی کردی گئی۔

(۲) شرک فی الصفات: یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات جس طرح ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہنے والی ہے، اسی طرح اس کی صفات بھی ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہنے والی ہیں، اس کا منکر بھی مشرک کہلاتا ہے، یعنی غیر اللہ کو غیب کا جاننے والا کہنا، حاضر وناظر (ہر جگہ موجود) یا اللہ کے علاوہ کسی کو اپنی ضرورت پورا کرنے والا سمجھنا اور اسباب سے اُوپر اُٹھ کر مددگار ماننا یہ ساری صورتیں شرک فی الصفات میں داخل ہیں۔

(۳) شرک فی العبادت: وہ اطاعت یا فرمانبرداری جو صرف اللہ کے لیے ہونی چاہیے اپنی زبان سے، اپنے عمل سے یا اپنے عقیدے سے یہ ظاہر کرے کہ یہ ہمارا کردار اللہ کے علاوہ کسی کو بتلانے دکھانے کے لیے ہے یہ بھی شرک کی ایک قسم ہے، جس کو رِیا کاری یا دکھاوے سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

اسلام نے شرک کی نفی کیوں کی ہے؟

دنیا میں زندگی گزارنے والا، عقلِ سلیم رکھنے والا ہر شخص اِس بات کو قبول کرتا ہے کہ احسان کرنے والے کے ساتھ احسان اور اچھائی کا معاملہ کرنا چاہیے، کوئی یہ نہیں کہتا کہ احسان کرنے والے مالک کے ساتھ دغابازی اور غداری کا برتاؤ کیا جائے، اس سے یہ سمجھنا چاہیے کہ جس ذات نے ہمیں وجود بخشا، قوت وطاقت عطا فرمائی، دنیا میں رہنے کے لیے ہر طرح کی سہولتوں کو لگا دیا، اچھے بُرے میں امتیاز پیدا کرنے کے لیے عقل

اورفہم عطا فرمائی، سننے کے لیے کان، دیکھنے کے لیے آنکھیں دیں اور نہ جانے کتنی بے حساب نعمتوں سے نوازا، احسان فرمایا، ان تمام بے حدوحساب نوازشوں کے بعد ایک ایماندار غلام کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ اپنے مالک کا شکر بجالائے، اس کی فرمانبرداری کرے، اس کے حکم پر اپنی گردن جھکادے، ایسا نہیں کہ کھائے کسی کا اور گائے کسی کا۔

ان تمام احسانات کو مدنظر رکھتے ہوئے اسلام انسان کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ اپنے رب کے ان احسانات کا شکر ادا کرے، اس کی اطاعت کے ذریعہ، اس کی عبادت کرکے اس سے مدد مانگ کرکے اس سے اپنی قسمت کو منوا کرکے اس کے برخلاف اگر کوئی خدا کو تسلیم نہ کرے، اس کی صفات میں کسی کو شریک کرے تو یہ پیدا کرنے والے مالک کے ساتھ غداری ہوگی نہ کہ وفاداری، اسی غداری کو شرک کہا جاتا ہے، قرآنِ کریم نے چار طریقوں سے شرک کو رَد کیا ہے۔

پہلا طریقہ: سب سے پہلے مشرکین سے دلیل کا مطالبہ کیا: ﴿هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ؕ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ ۝﴾ (الانعام:۱۴۸) اگر تمہارے پاس اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانے میں کوئی دلیل ہے تو لاؤ پیش کرو دلیل کچھ نہیں ہے محض تم نے یہ گھڑ رکھا ہے۔

دوسرا طریقہ: کبھی معبودانِ باطلہ اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے درمیان برابری کو یکسر مسترد کرتے ہوئے مشرکین سے پوچھا کہ عبادت جو بندے کی جانب سے نہایت اعلیٰ درجہ کی تعظیم ہے، تو اس کا مستحق بھی اعلیٰ درجہ کی ذات یعنی اللہ ہی کو ہونا چاہیے ﴿هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۝﴾ اللہ تبارک وتعالیٰ آسمان سے بارش برساتا ہے، زمین سے غلّہ اُگاتا ہے، کیا اس کا کوئی ہم پلہ ہوسکتا ہے جو ان صفات کا حامل ہو؟ (فاطر:۳)

تیسرا طریقہ: یہ فرمایا کہ دنیا میں آنے والے ہزاروں پیغمبروں میں سے کسی ایک نے بھی شرک کی تائید نہیں کی، سب ہی نے یہ تعلیم دی کہ ایک خدا کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو، یعنی جس طرح عقلی اور فطری دلائل سے توحید کا ثبوت ملتا ہے اور شرک کا رَد ہوتا ہے، ایسے ہی نقلی اور طبعی طور پر انبیاء علیہم السلام کا اجماع بھی یہ ثابت کرتا ہے کہ شرک کی کوئی حقیقت نہیں ہے ﴿وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ۝﴾ ہم نے آپ علیہ السلام سے قبل کسی رسول کو توحید کے پیغام کے بغیر نہیں بھیجا۔ (الانبیاء:۲۵)

چوتھا طریقہ: یہ ذکر کیا کہ شرک و بُت پرستی ایک قبیح عمل ہے، ذرا یہ بتلاؤ پتھروں کے تراشے ہوئے بُت اتنی صلاحیت بھی نہیں رکھتے کہ وہ انسانی کمالات کو حاصل کرسکیں، انسان کی خوبیوں سے بھی جو محروم ہیں تو وہ خدا

کیسے ہو سکتے ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ لَنۡ یَّخۡلُقُوۡا ذُبَابًا وَّ لَوِ اجۡتَمَعُوۡا لَہٗ ؕ وَ اِنۡ یَّسۡلُبۡہُمُ الذُّبَابُ شَیۡئًا لَّا یَسۡتَنۡقِذُوۡہُ مِنۡہُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَ الۡمَطۡلُوۡبُ ۝﴾ اللہ کو چھوڑ کر جن بُتوں کی تم پوجا کرتے ہو وہ ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے، تنہا تو بہت دُور، سارے مل کر بھی نہیں کر سکتے اور اس سے آگے بڑھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی مکھی ان بتوں کے پاس سے کوئی چیز لے کر بھاگ جائے تو وہ اس کو دوبارہ خود حاصل بھی نہیں کر سکتے۔ (الحج: ۷۳)

ان چار طریقوں سے قرآنِ کریم نے شرک و بُت پرستی کا رَد فرمایا اور انسانوں کے دلوں میں اس کی قباحت وشناعت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

❑❖❑

قسط نمبر (۲)

ماہِ ربیع الاوّل

ازقلم:
شیخ عتیق الرحمٰن قاسمی
بتحفظ سنت دارالعلوم دیوبند

ربیع الاوّل کا مہینہ اسلامی تاریخ ہی نہیں؛ بلکہ دنیا کی تاریخ میں ایک پاکیزہ اور مقدس انقلاب کی علامت ہے، یہ وہ مہینہ ہے، جس میں کائنات کی سب سے عظیم ہستی، پیغمبر اسلام، خاتم النبیّین، سیّد الانبیاء حضرت محمد ﷺ دنیا میں تشریف لائے اور دنیا میں ایک مقدس و پاکیزہ انقلاب کی بنیاد رکھی، جو دنیا کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ ﷺ کی پوری زندگی اعلیٰ اخلاق، انسانی اقدار، محبت، شرافت، انسانی ہمدردی، غمخواری، کمزوروں، ضعیفوں، یتیموں، بیواؤں کی خبر گیری، رحمدلی، صداقت وامانت اور عدل وانصاف کی اعلیٰ ترین مثال اور نمونہ ہے، ایک بہترین اور آئڈیل انسان کے اندر جتنی بھی خوبیاں اور کمالات ہوسکتے ہیں وہ سب آپ کے اندر بدرجہ اتم موجود تھے، یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ کے زمانے سے لے کر آج تک ہر وہ آدمی جو حق وصداقت کا معترف ہے، اس نے آپ ﷺ کی خوبیوں اور کمالات کا نہ صرف اعتراف کیا ہے؛ بلکہ ان کے سامنے اپنی جبین عقیدت کو خم کیا ہے، اور آپ ﷺ کے پیغام اور آپ کی تعلیمات کو اپنا کر دنیا وآخرت کی کامیابی حاصل کی۔

ہم تمام مسلمانوں کے لیے یہ اللہ کی سب سے بڑی نعمت اور اس کا خاص فضل ہے کہ اللہ نے ہمیں اپنے پیارے رسول ﷺ کی امت میں پیدا کیا ہے، ہم اس نعمت اور فضل پر اللہ کا جتنا شکر ادا کریں کم ہے، اور شکر کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی کو رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات اور آپ کی سنتوں کے مطابق ڈھال لیں۔ ربیع الاوّل کا مہینہ ہر سال ہمیں یاد دلاتا ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے جو پیغام پوری دنیا کے سامنے پیش کیا اور جن اخلاق وصفات کی تعلیم دی، ہم پہلے ان خوبیوں اور اخلاق وصفات کو اپنے اندر پیدا کریں اور دنیا کے سامنے عملی طور پر ان کو پیش کریں۔ یہی جناب نبی کریم ﷺ کی سچی پیروی اور ان سے حقیقی محبت وعقیدت کی علامت ہے۔ ربیع الاوّل کا یہ مہینہ ہم مسلمانوں کو ہماری ذمہ داری کا احساس کراتا ہے کہ اللہ نے جس مشن کے لیے جناب نبی کریم ﷺ کو مبعوث کیا تھا یعنی پوری دنیا میں اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے اور خدائے وحدہٗ لاشریک

کے پسندیدہ دین کو قائم کرنے کے لیے اور جو مشن آپ کے بعد رہتی دنیا تک کے لیے امت کے علماء اور تعلیم یافتہ لوگوں کے ذمہ کر دیا گیا ہے۔

کیا ہم اس ذمہ داری کو انجام دے رہے ہیں؛ لیکن آہ کہ! آج رسولِ عربی ﷺ فداہ روحی، ابی، وامی کے نام لیوا اور اس کے عشق ومحبت کے دعویدار ماہِ ربیع الاوّل میں ''عید میلاد النبی'' کے دلنشیں نام پر جو وقتی اور بے روح محفلیں منعقد کرتے ہیں اس کے تصور ہی سے روح تھرّا اُٹھتی ہے اور کلیجہ منھ کو آنے لگتا ہے۔ ملّتِ اسلامیہ کی یہ کیسی بدبختی و بدنصیبی ہے کہ سیرتِ پاک اور میلاد النبی ﷺ کے نام پر اس بے سروپا رسمیں اور طوفان بے تمیزی کا مظاہرہ ہوتا ہے کہ کچھ دیر کے لیے شیطان بھی شرما جاتا ہے۔ دل کی دنیا تاریک وتباہ ہوتی جاتی ہے؛ مگر اس کی فکر سے بے پرواہ بازاروں کے گلی اور کوچے برقی قمقموں سے منور اور خوشنما جھنڈیوں سے سجائے جاتے ہیں۔ چار چار اور چھ چھ گھنٹے حضورِ اقدس ﷺ کے نام پر جلوس میں گزار دیے جاتے ہیں؛ مگر اسلام کے رکن اوّلین نماز کا خیال تک نہیں آتا۔

میلاد النبی کے ان جلسوں اور جلوسوں میں فکر ننگ وناموس سے بے نیاز ہوکر مردوں اور عورتوں کا جس طرح اجتماع اور اختلاط ہوتا ہے عہد جاہلیت کا جشن نوروز بھی اس کے آگے ماند پڑ جاتا ہے اور قوم وملّت کا اس قدر سرمایہ ان سطحی اور غیر شرعی مجلسوں کی زیبائش وآرائش پر صرف ہوتا ہے کہ اس کا اندازہ بھی دشوار ہے۔

محسن کائنات کے عشق کے مدعیو! ذرا کچھ تو غور وفکر اور ہوش سے کام لو وہ دعویٔ محبوبیت یکسر فریب ہے جو اطاعت واتباع سے خالی ہو۔

لَوْ كَانَ حُبُّكَ صَادِقًا لَأَطَعْتَه ❖ لِأَنَّ الْمُحِبَّ لِمَنْ يُحِبُّ يُطِيْع

تم زبان سے محبت رسول کا دم بھرتے ہو؛ مگر تمہارے طور طریقے اور اعمال واشغال تعلیماتِ رسول ہدایاتِ محبوب ﷺ کے سراسر خلاف ہیں۔

خدارا! ہوش میں آؤ اور دیکھو دنیا کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہے اور تم ہو کہ ان سطحی اجتماعات اور غیر شرعی رسومات میں اپنی طاقت، سرمائے اور وقت کو برباد کر رہے ہو اور اس طرح اپنی دنیا کو تباہ وبرباد کرنے کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی ناراضگی بھی اپنے ہاتھوں خرید رہے ہو۔

اللہ تعالیٰ نے صاف لفظوں میں اعلان فرمادیا ہے کہ دنیا وآخرت کی کامیابی اللہ کے احکام کے پورا کرنے اور رحمتِ عالم ﷺ کے طریقے پر چلنے میں ہے۔

ارشادِ ربانی ہے:

﴿فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ (النور، پ:۱۸)

(جولوگ اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں انھیں اس بات سے ڈرنا چاہیے کہ ان پر کوئی آفت آجائے یا ان پر کوئی دردناک عذاب نازل ہوجائے)

ایک موقع پر ارشاد ہے:

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَ لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ (النحل، پ:۱۴)

(جوشخص نیک کام کرے مرد ہو یا عورت بشرطیکہ ایمان والا ہوتو ہم اسے ضرور اچھی زندگی بسر کرائیں گے (یہ دنیا میں ہوگا اور آخرت میں) ان کے اچھے کاموں کے بدلے میں ان کو اجر دیں گے)

ان آیات پر غور کریں اور دیکھیں کہ ہم اپنے اعمال واخلاق کے ذریعہ اپنے آپ کو موردِ آفتاب اور مستحق عذاب بنارہے ہیں یا دنیا میں حیاتِ طیبہ (راحت کی زندگی) اور آخرت میں اجروثواب کے لائق بن رہے ہیں۔

رسولِ خدا ﷺ کا پاک ارشاد ہے:

قد افلح من اخلص قلبه للإيمان وجعل قلبه سليمًا ولسانه صادقًا ونفسه مطمئنة وخليقة مستقيمة وجعل إذنه مستمعة وعينه ناظرة.

(الحدیث رواہ الامام احمد فی مسندہ: ۵/ ۱۴۸)

یقیناً وہ شخص کامیاب ہوگیا جس نے اپنے دل کو ایمان کے لیے خالص کرلیا اور اپنے دل کو (کفر وشرک اور نفسانی رذائل) سے پاک وصاف کرلیا، اپنی زبان کو سچا رکھا اپنے نفس کو مطمئن بنالیا (کہ اس کو اللہ کی یاد سے اور اس کی مرضیات پر چلنے سے اطمینان وسکون ملتا ہو) اپنی طبیعت کو درست رکھا (کہ وہ بُرائی کی طرف نہ چلتی ہو) اپنے کان کو حق سننے والا بنایا اور اپنی آنکھ کو (ایمان کی نگاہ سے) دیکھنے والا بنایا۔

آخر میں مَیں اپنی بات مروجہ میلاد النبی ﷺ کی تاریخ بتلا کر اپنی بات ختم کرتا ہوں۔

عید میلاد النبی ﷺ کی شروعات کب سے ہوئی؟ یہ ایک بہت بڑی غلطی اس ماہ میں (عید میلاد النبی ﷺ) کی ایجاد ہے، جس کو ایک ظالم اور فضول خرچ بادشاہ (ملک مظفر الدین) نے اپنے زمانے میں شروع کرایا تھا، اور اس دَور کے علماء کو حکم دیا کہ وہ اپنے اجتہاد پر عمل کریں اور اس میں کسی غیر کے مذہب کی اتباع نہ کریں، تو

اس وقت کے وہ علماء جو اپنے دنیوی اغراض ومقاصد کی سرتوڑ کوششیں کررہے تھے اس کی جانب مائل ہوئے، جب انھیں موقع ملا تو ربیع الاوّل کے مہینے میں عید میلاد النبی ﷺ منانا شروع کیا، مسلمانوں میں سب سے پہلے عید میلاد النبی ﷺ منانے والا شخص ملک مظفر الدین ہے، جو موصل کے علاقے اربل کا بادشاہ تھا''؛ اِس لیے یہ اسلام کے خلاف اور تعلیماتِ نبوی ﷺ کے بھی خلاف ہے، اسلام کو ان عارضی اور ظاہری شان وشوکت کی قطعاً ضرورت نہیں ہے؛ کیونکہ اسلام کی شان وشوکت تو یہ ہے کہ جب خلیفۂ ثانی سیّدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ملک شام تشریف لے گئے اور وہاں کے لوگوں نے نیا لباس پہننے کو کہا تو فرمایا کہ: ''**نحن قوم أعزّنا الله بالإسلام**'' (کہ ہم مسلمان ایسی قوم ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو اسلام کے ذریعہ عزت بخشی ہے) اگر ہم سچے مسلمان ہیں تو ہماری عزت بے سروسامانی میں بھی دنیا کرے گی۔

الغرض! آج مسلم معاشرے میں وہی بے ایمانی وبے یقینی، وہی خدا سے دُوری، وہی رسوم ورواج کے بندھنوں میں جکڑے رہنے کی عادت، وہی روایات وخرافات کی اُلجھنوں میں پریشان رہنے کا مزاج بڑھتا اور پنپتا جارہا ہے، ضرورت ہے ہم اِس سلسلہ میں سنجیدگی کے ساتھ غور کریں، جاہلانہ رسوم ورواج کا بائیکاٹ کریں اور علماء کی نگرانی میں اسلامی تعلیمات کا مطالعہ کریں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اسلامی عقائد پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہنے اور بدعات ورسومات سے اجتناب کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

❑❖❑

مدارسِ اسلامیہ کی بقاء کیوں ضروری ہے؟

ازقلم:
مولانا فاروق صاحب مفتاحی

رسول اللہ ﷺ نے ارشادفرمایا:

يَحْمِلُ هٰذَاالْعِلْمَ مِنْ كُلِّ خَلَفٍ عُدُوْلُهُ يَنْفُوْنَ عَنْهُ تَحْرِيْفَ الْغَالِيْنَ وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِيْنَ وَتَأْوِيْلَ الْجَاهِلِيْنَ. (رواه البيهقي)

ترجمہ: ہرآئندہ آنے والی جماعت میں سے اس کے نیک لوگ اس (کتاب وسنت) کے علم کو حاصل کریں گے اور وہی لوگ اس علم کے ذریعہ (آیات واحادیث میں) حد سے گزر جانے والوں کی تحریف کو، باطل پرستوں کی افتراء پردازی کو اور جاہلوں کی تاویلات کو ختم کریں گے۔

تعلیم اور تربیت کا انسانی زندگی پر نہایت گہرا اثر پڑتا ہے عمدہ اخلاق اور اعلیٰ کردار شخصیت کے پیچھے چھپی خاص سوراور منفرد طرزِ حیات کی نشادگی کرتے نظر آتے ہیں، جب تک انسان اپنی اصل فطرت پر قائم رہتا ہے، تمام خوبیاں اس سے ظاہر ہوتی رہتی ہیں، اس کے برخلاف جب آدمی اپنی خداداد فطرت کو چھوڑ کر سرکشی اور طاغوتی صفت سے متصف ہوجائے تو اس کی طبیعت ہر اچھے بُرے فعل کو روا سمجھنے لگتی ہے اور انسان انسانیت سے نکل کر حیوانیت کے راستے پر چل پڑتا ہے۔

تعلیم سے انسانی سوچ وفکر کی اصلاح ہوتی ہے اور تربیت سے انسانی کردار وعمل دونوں کی اصلاح کا انتظام ہوتا ہے، خیال وفکر کی اصلاح کے لیے شریعت عطا فرمائی گئی اور کردار کی اصلاح کے لیے نبی اور رسول کو مبعوث فرمایا گیا، دونوں چیزیں انسانی فطرت کے عین مطابق ہیں۔

انبیاء اور رسل کا سلسلہ ختم ہوجانے کے بعد نبی علیہ السلام کے ورثاء علماء وصلحاء اس وراثت کو تقسیم کرتے ہیں، وہ علوم جو انسانی سوچ وفکر کو صحیح سمت کی طرف گامزن کرتے ہیں علومِ شریعت کے نام سے اور جو علوم درست اور کامیاب کردار کی طرف راہنمائی کرتے ہیں علومِ طریقت کے نام سے جانے جاتے ہیں، آدمی جہاں اپنی سوچ اور فکر کی اصلاح قدرت کے قانون کے مطابق سیکھتا ہے ان کو مدارسِ اسلامیہ کہا جاتا ہے اور جہاں کردار کی درستگی کرائی جاتی ہے وہ خانقاہوں کے نام سے موسوم ہیں۔

مدارسِ اسلامیہ میں انسان کی پیدائش سے لے کر دنیا سے چلے جانے تک سارے وہ معاملات جو اس کو پیش آتے ہیں قانونِ الٰہی کے ذریعہ سکھلائے جاتے ہیں، جس کی وجہ سے ذہنوں میں بھٹکتے تاریک اور بے بنیاد خیالات کا ازالہ بھی ہوجاتا ہے، مثلاً دنیا میں زندگی گزارنے والے ایک شخص کے ذمہ کن فرائض کا ادا کرنا ضروری ہے اور کون سے حقوق اس کے لیے لازم ہوتے ہیں، گھر، شہر، سوسائٹی اور باہم رشتہ داریوں میں کون سے کام رَوا ہوسکتے ہیں اور کون سے نہیں، ذمہ دار اور غیر ذمہ دار شخص کے آداب کیا ہیں، معاشرت اور رہن سہن کا عملی نمونہ کیا ہونا چاہیے، زندگی وموت کا مقصد کیا ہے، حیات کس طرح بسر ہو اور موت کے حالات کا کیسے سامنا کیا جائے وغیرہ بے شمار چیزیں مدارسِ اسلامیہ کا بنیادی ہدف ہیں، اگر ان مقاصد اور اہداف کو پسِ پشت ڈال دیا جائے، عقل اور سوچ کو بے لگام کردیا جائے، یعنی یہ سمجھ لیا جائے کہ ہماری فکر علومِ الٰہی سے بے پرواہ ہوکر جس کو چاہے اپنالے اور جسے چاہے ترک کردے، تب معاشرے میں ایسا کوئی پیمانہ نہیں ہوسکتا جس پر رکھ کر کسی کی سوچ وفکر کو تولا جائے اور یہ فیصلہ کیا جائے کہ یہ غلط ہے اور یہ صحیح ہے۔

عقل وشعور ہر شخص میں موجود ہے؛ لیکن یہ عقل وشعور آگے بڑھنے میں ایک ایسے قانون اور ضابطے کے محتاج ہیں جس پر چل کر درست اور صحیح رُخ کو طے کیا جاسکے۔

ہمارا یہ دیکھنا ہے کہ دنیا میں جو شخص قدرتی قوانین سے خود کو آزاد کروالیتا ہے، اس کے یہاں زندگی گزارنے کا کوئی ایسا معیار نہیں ہوتا، جسے دیکھ کر وہ یہ سمجھ سکے کہ میرا یہ عمل درست ہے اور یہ درست نہیں ہے؛ بلکہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ میری سمجھ میں ہے وہ صحیح اور درست ہے، باقی سب کچھ بے کار اور لغو ہے۔

عقل وفکر کے تفاوت کی وجہ سے پیدا کرنے والے رب نے جینے کا طریقہ بھی بتلایا، جس کو ہم علمِ شریعت کہتے ہیں دنیا بھر میں مدارسِ اسلامیہ خاص طور پر اسی علم کے علمبردار ہیں۔

دنیا میں وہ ممالک جہاں مدارسِ اسلامیہ کا کوئی خاص کردار نہیں ہے وہ وہاں معاشرے میں اچھائی اور بُرائی کے درمیان امتیاز کرنے والا کوئی ایسا پیمانہ بھی نہیں ہے جو یہ بتلاسکے کہ فطرت اور خدائی منشاء کے مطابق زندگی کیسے گزاری جاسکتی ہے، زندگی گزارنے کا بہترین طریقہ کیا ہوسکتا ہے، موت کے بعد کیا ہوگا؟ یہ ساری چیزیں صرف اور صرف مذہبِ اسلام اور شریعتِ محمدیؐ میں پوشیدہ ہیں، جب تک ان قوانین پر عمل ہوتا ہے امن وسلامتی قائم رہتی ہے اور جب اس کو پسِ پشت ڈال دیا جاتا ہے فتنہ، فساد، لُوٹ مار، قتل وغارت گری ہر طرف دیکھنے میں آتی ہے۔

مدارسِ اسلامیہ کی بنیاد کا مقصد ہی ان علومِ الٰہی کی حفاظت ہے، جو انسان کو دنیا وآخرت میں کامیاب

وکامران کرسکتا ہے، اگر مدارسِ اسلامیہ نعوذ باللہ ختم کردیے جائیں تو زندگی گزارنے کا مقصد بتلانے والا کوئی علم موجود نہیں ہوگا، جس طرح جانور اپنی زندگی بسر کرتے ہیں، کھاتے ہیں، پیتے ہیں اور سوجاتے ہیں، انسان کے پیشِ نظر بھی یہی کچھ باقی رہے گا جانوروں اور انسانوں کی زندگی میں کوئی خاص فرق بھی نظر نہیں آسکے گا، جسکا مشاہدہ ہم بار بار کرتے رہتے ہیں۔

عام طور پر یہ اشکال کیا جاتا ہے کہ علومِ نبوت بغیر کسی معلّم اور سکھلانے والے کے بھی تو حاصل کیے جاسکتے ہیں، تو اس کے جواب میں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ علومِ نبوت کو صرف سیکھنا کافی نہیں ہے؛ بلکہ درست طریقے پر سیکھنا یہ بھی ضروری ہے، دنیا میں حاصل کیے جانے والے علومِ نبوت کے علاوہ دیگر علوم وفنون بھی اسی کے ماہر اور واقف کار سے حاصل کیے جاتے ہیں، تو علومِ نبوت جو انسان کی ابدی کامیابی کا ضامن ہیں وہ کیسے بغیر اس کے جاننے والے کے صحیح طور پر حاصل ہوسکتے ہیں؛ اِسی لیے حدیث مبارک میں فرمایا گیا کہ اس علمِ نبوت کو حاصل کرنے والے بے شمار ہوں گے؛ لیکن ان کی حفاظت عادل اور انصاف پسند علماء کے ذریعہ سے ہی ہوسکے گی، جو باطل اور بے بنیاد پھیلائے ہوئے پروپیگنڈوں کو دُور کریں گے اور صاف وشفاف اسلامی تعلیمات کا علم وعمل دنیا تک پہونچاتے رہیں گے، موجودہ زمانے میں اس چیز کو بہت زیادہ سمجھنے کی ضرورت ہے؛ اِس لیے کہ سب سے زیادہ کوتاہی علمِ نبوت کو سیکھنے اور سمجھنے میں ہورہی ہے۔

ایک بڑا طریقہ تو وہ ہوتا ہے جو علمِ شریعت سے بالکل بھی آشنا نہیں ہوتا، ایک طبقہ علمِ نبوت کو حاصل تو کرنے کی کوشش کرتا ہے؛ لیکن وہ صاف ستھرے علم کے چشمے نے الگ تھلگ گدلے اور غبار آمیز راستے سے ملا ہوتا ہے، جو آگے چل کر فکری کج روی کی شکل میں رونما ہوتا چلا جاتا ہے؛ اِس لیے جس طرح ہم اپنی دنیاوی ضرورتوں کے حصول میں نتیجے اور انجام کو ذہن میں رکھ کر فیصلہ کرتے ہیں، اس سے کہیں زیادہ علمِ نبوت کے حصول کے وقت سوچنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو فکری، خرابی اور عملی گراوٹ سے محفوظ فرمائے، آمین۔

❑❖❑

سلاسلِ اربعہ کی خصوصیات وتعلیمات

ازقلم:
مولانا یوسف صاحب مفتاحی

روحانی طاقت کو غذا دینے اور اس کو قوی کرنے کے طریقۂ تعلیم میں الگ الگ طریقے اختیار کیے گئے، جس کے نتیجے میں مختلف سلسلے اور طریقے پیدا ہوئے، چند کو زیادہ شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی، اُن میں:

(۱) ایک طریقۂ قادریہ ہے، اس کا انتساب سیّدنا امام عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کی طرف ہے، اس طریقہ کی خصوصیت وبنیاد نوافل کا اہتمام اور ذکر کی پابندی ہے؛ تاکہ اللہ تعالیٰ کا استحضار ہر وقت قائم رہے اور بندہ ہر وقت اپنے کو اللہ تعالیٰ کے دربار میں محسوس کرے، اِس طریقہ کی بہت ساری شاخیں ہیں اور اُس کے اشغال اور اوراد بہت متنوع ہیں۔

(۲) ایک ''چشتیہ'' ہے، بانی طریقہ حضرت خواجہ معین الدین حسن سنجری اجمیری رحمہ اللہ (متوفی ۶۳۲ھ) ہیں، ان کے مشائخ مقامِ چشت کے رہنے والے تھے (اس لیے یہ طریقہ ''چشتی'' کہا گیا)، اس کی دو شاخیں ہیں: ایک نظامیہ، جو محبوبِ الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاء رحمہ اللہ کی طرف منسوب ہے، ان کے خلفاء کے ذریعہ یہ دولت عشق ومعرفت حاصل ہوئی، دوسری صابریہ ہے، جو حضرت پیرانِ کلیر شیخ علی صابر کلیری رحمہ اللہ کی طرف منسوب ہے، جس کے آخر میں سب سے روشن چراغ سیّد الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ ہوئے اور اس کی برکات عرب وعجم میں ان کے خلفاء کے ذریعہ عام ہوئیں۔ طریقۂ چشتیہ کی اَساس حفظِ انفاس کے ساتھ ذکر بالجہر پر ہے اور شیخ سے محبت وتعظیم کا تعلق رکھنے پر اور چلّہ کشی، روزہ کی کثرت، تہجد کی پابندی، وضو کے اہتمام، کم کھانے، کم سونے، کم بولنے اور ترکِ غفلت (استحضار) پر ہے، اس کے علاوہ بھی ان کے اشغال ہیں۔ ہندوستان میں سب سے پہلے اسی طریقہ کی اشاعت ہوئی اور پورے ملک میں یہ سلسلہ پھیل گیا، اس سلسلہ کی اصلاً دو شاخیں ہیں: نظامیہ وصابریہ، ان سے بہت سی شاخیں وجود میں آئیں۔

(۳) ایک ''نقشبندیہ'' ہے، اس کے بانی حضرت خواجہ بہاء الدین محمد نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، بخارا کے رہنے والے تھے، وہیں مزار ہے، اس طریقہ کی بنیاد عقائدِ دینیہ کی تصحیح اور کثرتِ عبادت اور حضور مع اللہ پر ہے، ان کا کہنا ہے کہ اللہ تک پہنچنے کے تین طریقے ہیں: ذکر، مراقبہ، ربطِ شیخ[1] اور نفی اثبات کا ذکر حبسِ نفس کے ساتھ،

(۱) ''ربطِ شیخ'' کا مطلب یہ ہے کہ: شیخ کی خدمت میں حاضری دیتا رہے، دل سے محبت کرے، شیخ کے فیضان کا اُمیدوار رہے اور کسی عارض کی وجہ سے حاضری نہ دے سکے تو دل سے محبت وعقیدت کے جذبات کے ساتھ اس کے لیے دعا =

جو کہ متقدمین سے مروی ہے۔ ذکر کا دوسرا طریقہ اثبات محض ہے۔ مراقبہ یہ ہے کہ انسان اپنے سارے ادراک واحساس کے ساتھ اس ذات مجرد کی طرف متوجہ ہوجائے جس کو لفظ ''اللہ'' سے لوگ جانتے ہیں، لفظ سے الگ ہوکر محض ذات کا تصور کرنا بہت کم ہے، مراقب کا کام یہ ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ کی طرف توجہ الفاظ سے الگ ہوکر کرے اور اللہ کی طرف وساوس اور دوسرے خیال سے اپنے کو علیٰحدہ کر کے متوجہ ہوجائے۔(۱)

اِس طریقہ کی بھی بہت سی شاخیں پھیلیں؛ لیکن اصلاً دو بڑی شاخیں: ''باقیہ'' اور ''علائیہ'' ہیں، باقیہ کو حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کی نسبت زیادہ رواج وقبولیت ملی، اس کی اہم شاخوں میں ''ولی اللّٰہیہ'' ہے، جس کا انتساب حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کی طرف ہے اور ''محمدیہ احمدیہ'' ہے، جس کا انتساب امیر المؤمنین حضرت سیّد احمد شہید رائے بریلوی رحمہ اللہ کی طرف ہے، طریقۂ محمدیہ کو اللہ نے بڑی مقبولیت عطا فرمائی، اس طریقہ سے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمہ اللہ نے بڑا استفادہ کیا اور یہ طریقہ ان تمام طریقوں کا جن کا یہاں ذکر ہوا جامع ہے۔ اس طریقہ کی خصوصیت ہم شیخ الاسلام والمسلمین برکۃ العصر حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی حسنی ندوی دامت برکاتہم کی شہرۂ آفاق تصنیف ''سیرت سیّد احمد شہیدؒ'' سے نقل کرتے ہیں، وہ رقمطراز ہیں:

> ''دین کا ایک مہتم بالشان شعبہ جس کے آپ اپنے دَور میں مجدد تھے، اور جو دراصل پورے نظامِ دینی کی روح ہے، وہ ''ایمان واحتساب'' ہے، یعنی زندگی کے تمام اعمال واشغال میں صرف رضائے الٰہی کی طلب، نیت کا استحضار ہو اور وہ موعود اجر وثواب کی طمع میں انجام پائیں۔ آپ نے اس ''ایمان واحتساب'' کو مکمل سلوک بنادیا تھا اور چاروں طرق کے ساتھ آپ اس میں بھی بیعت لیا کرتے تھے اور آپ اس کو ''طریقۂ محمدیہ'' کے نام سے موسوم کرتے تھے''۔

حضرت سیّد احمد شہید رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: ''ہم طریقۂ محمدیہ'' کے اشغال کی تعلیم اس طرح کرتے ہیں کہ کھانا اس نیت سے کھایا جائے، کپڑا اس نیت سے پہنا جائے، نکاح اس نیت سے کیا جائے، سونے کی نیت یہ ہونی چاہیے، زراعت، تجارت، ملازمت کی نیت یہ ہونی چاہیے، اِس طریقہ کی نسبت آنحضرت ﷺ سے ظاہری ہے۔ (ملاحظہ ہو: سیرت سیّد احمد شہیدؒ: ج/۲، ص/۵۱۱-۵۱۲)

اس طریقہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس سے پوری زندگی اپنی تمام عبادات وعادات کے ساتھ خالص عبادت اور تقرب الی اللہ کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔

= کرے، بتائی ہوئی باتوں اور تعلیم وتلقین کا اہتمام کرے، اگر اس کی تصنیفات وملفوظات ہوں تو ان کا مطالعہ اِس طرح کرے کہ جیسے شیخ کی مجلس میں حاضر ہو۔ (افادہ داعی اسلام حضرت مولانا سیّد عبداللہ حسنی صاحب نور اللہ مرقدہٗ)

(۲) ملاحظہ ہو: اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں از علامہ سیّد عبدالحئی حسنی سابق ناظم ندوۃ العلماء، مطبوعہ دار المصنّفین۔

دوسری خصوصیت یہ ہے جسے حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمہ اللہ نے بیان کیا، وہ فرماتے ہیں:

''سیّد صاحب توحید ورسالت واتباعِ سنت پر بیعت لیتے تھے اور اتباعِ سنت کے لیے ازحد تاکید فرمایا کرتے تھے اور بدعت کے سخت ماحی ومخالف تھے''۔ (ملاحظہ ہو: سیرت سیّد احمد شہیدؒ: ج/۲، ص/۵۳۸)

(۴) ایک ''طریقۂ سہروردیہ'' ہے، اس کے بانی شیخ شہاب الدین عمر سہروردی مصنّف ''عوارف المعارف'' ہیں، اِس طریقہ کی بنیادی باتیں یہ ہیں:

رات ودن کے اوقات کو نظام کے ساتھ ان کاموں میں لگا دینا جو مناسب وبہتر ہیں۔ مثلاً روزہ، تہجد، ادعیۂ ماثورہ کی پابندی اور اوراد ووظائف کی پابندی، نفی واثبات کے ذکر میں مشغول رہنا، اِس طرح کہ قلب پر اثر انداز ہو اور اس کے علاوہ اور بھی بہت سے اشغال ہیں۔ ہندوستان میں یہ طریقہ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی رحمہ اللہ کے ذریعہ آیا، انھوں نے یہ طریقہ خود بانئ طریقہ سے اخذ کیا تھا۔

ان چاروں سلسلوں کے مختصر تعارف کے بعد ان میں داخل ہونے والے اور کسی متبع السنت شیخ کے ہاتھ میں ہاتھ دینے والے کے لیے ضروری وانفع چیز لکھی جاتی ہے جو حضرت مولانا عبدالحئ حسنی (مصنّف نزہۃ الخواطر وسابق ناظم ندوۃ العلماء) نے ان سلاسل کا تعارف کرانے سے پہلے تصوف وسلوک کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرمایا ہے، وہ کہتے ہیں:

''ارشادِ رسول اللہ ﷺ ہے کہ جو ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ'' کی گواہی دیتے ہوئے وفات پائے گا وہ جنت میں داخل ہوگا۔ مُرید کے لیے ضروری ہے کہ ان مقامات میں وہ برابر ترقی کرتا رہے اور ان مقامات کے لیے طاعات واخلاص اصل ہے اور اس کی بنیادی اور مقدم شرط ایمان ہے، پھر اس کے نتیجہ میں کچھ احوال وصفات اور نتائج وثمرات ظاہر ہوتے ہیں، یہاں تک کہ مرید درجہ بدرجہ توحید اور معرفت کے بلند مقام پر پہنچ جاتا ہے، اگر کسی مقام وحالت میں صحیح اور مطلوب ثمرات نہ حاصل ہوں تو سمجھ لینا چاہیے کہ پہلے والے مقام میں کوئی تقصیر رہ گئی ہے اور ٹھیک اسی طرح وارداتِ قلبی اور کیفیاتِ نفسی میں بھی سمجھنا چاہیے؛ اِس لیے ضروری ہے کہ مرید اپنے ہر قول وفعل کا محاسبہ کرتا رہے اور جائزہ لیتا رہے؛ کیونکہ اعمال کے نتائج وثمرات کا ظہور ضروری ہے اور اگر نتائج وثمرات ٹھیک طور پر نہیں ظاہر ہو رہے ہیں تو اس کا سبب عمل میں کوئی کمی یا کوتاہی ہے۔ مُرید اپنے اعمال کا محاسبہ اپنے ذوق ووجدان کے ذریعہ کرتا ہے؛ لیکن یہ صفت بہت کم لوگوں کو حاصل ہے اور عام طور پر لوگ اس معاملہ میں غفلت کا شکار ہیں۔

❑❖❑